تدبّرِ قرآن

۶۸

القلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ سابق سورہ ——— الملک ——— کا مثنیٰ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود اور موضوع میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف طرزِ بیان، نہج استدلال اور لب ولہجہ میں فرق ہے۔ جس طرح سابق سورہ میں قریش کو عذاب اور قیامت سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی ان کو عذاب و قیامت سے ڈرایا گیا ہے لیکن اس سورہ کا لب ولہجہ سابق سورہ کے مقابل میں تیز ہے۔

سابق سورہ کے آخر میں قریش کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ اِنْ اَھْلَکَنِیَ اللّٰہُ وَمَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ یُّجِیْرُ الْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ کہ اس خبط میں نہ رہو کہ میں کوئی شاعر اور دیوانہ ہوں جس کو گردشِ روزگار بہت جلد فنا کر دے گی۔ تمھاری یہ توقع بالفرض پوری بھی ہو جائے جب بھی تمھارے لیے اس میں اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ تمھیں خدا کے عذاب سے بچانے والا کون بنے گا؟ اس سورہ میں اسی مضمون کی تائید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ کی پیش کردہ کتاب اور آپ کے اعلیٰ کردار کا موازنہ قریش کی ناعاقبت اندیش قیادت کے کردار سے کر کے یہ دکھایا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب موافق و مخالف دونوں پر واضح ہو جائے گا کہ کن کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو ان کو تباہی کی راہ پر لیے جا رہے ہیں اور کون لوگ ہدایت کی راہ پر ہیں اور وہ فلاح پانے والے بنیں گے۔

اس کے بعد باغ والوں کی تمثیل کے ذریعہ سے قریش کو متنبہ فرمایا ہے کہ آج جو امن و اطمینان تمھیں حاصل ہے اس سے اس دھوکے میں نہ رہو کہ اب تمھارے اس عیش میں کوئی رخنہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جس خدا نے تمھیں یہ سب کچھ بخشا ہے اس کے اختیار میں اس کو چھین لینا بھی ہے۔ اگر تم اس سے نچنت ہو بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ وہ چشمِ زدن میں تم کو اس سے محروم بھی کر سکتا ہے۔ پھر تم کفِ افسوس ملتے ہی رہ جاؤ گے۔

آخر میں مکذبینِ قیامت کی اس فاسد ذہنیت پر ضرب لگائی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو عیش و آرام انھیں یہاں حاصل ہے اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی انھیں یہی کچھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حاصل ہو گا۔ ان سے سوال کیا ہے کہ آخر انھوں نے خدا کو اتنا نامنصف کس طرح سمجھ رکھا ہے کہ وہ نیکوں اور

بدوں میں کوئی امتیاز نہیں کرے گا؛ ساتھ ہی ان کو چیلنج کیا ہے کہ اگر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا کوئی عہد کرا لیا ہے یا کوئی ان کے لیے اس کا ضامن بنا ہے تو اس کو پیش کریں۔ اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آج جو سخن سازیاں یہ لوگ کر رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جب قیامت کی ہلچل برپا ہوگی تب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جو خواب وہ دیکھتے رہے تھے وہ حقیقت سے کتنے دور تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے استدراج کے پھندے میں پھنس چکے ہیں اور اس کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا ان کے لیے کوئی امکان نہیں ہے تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس طرح کی عجلت سے بچو جس میں یونس علیہ السلام مبتلا ہوئے اور جس کے سبب سے ان کو ایک سخت امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔

سُوْرَۃُ الْقَلَمِ (٦٨)

مَكِّيَّةٌ ——— آیات : ٥٢

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ١-٥٢

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (١) مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (٢)
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (٣) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (٤)
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ (٥) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (٦) اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (٧)
فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (٨) وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (٩)
وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (١٠) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ (١١)
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (١٣)
اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ (١٤) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (١٥) سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (١٦) اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ
كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (١٧)
وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ (١٨) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ
نَآئِمُوْنَ (١٩) فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (٢٠) فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ (٢١)
اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (٢٢) فَانْطَلَقُوْا

وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ﴿٢٣﴾ أَنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِسْكِينٌ ﴿٢٤﴾
وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَضَالُّونَ ﴿٢٦﴾
بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٢٧﴾ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا
تُسَبِّحُونَ ﴿٢٨﴾ قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿٢٩﴾ فَأَقْبَلَ
بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ ﴿٣٠﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا
طَاغِينَ ﴿٣١﴾ عَسَىٰ رَبُّنَا أَنْ يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِنْهَا إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا
رَاغِبُونَ ﴿٣٢﴾ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ (وقف لازم)
كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٣٤﴾ (ع)
أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٦﴾
أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿٣٨﴾
أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ
لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ أَيُّهُمْ بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ﴿٤٠﴾ أَمْ لَهُمْ (مع)
شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٤١﴾ يَوْمَ
يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٤٢﴾
خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ
إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَٰذَا
الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾ وَأُمْلِي
لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٤٥﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ

مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾

وقف لازم — وقف لازم — ع ۲/۱۹

ترجمہ آیات ۱ تا ۵۲

یہ سورۂ ن ہے۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں کہ تم اپنے رب کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو اور تمہارے لیے یقیناً ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو۔ پس تم بھی عنقریب دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ فتنہ میں پڑا ہوا تم میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ انھیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱-۷

پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔ اور تم بات نہ سنو ہر جھوٹی قسمیں کھانے والے، ذلیل، اشارہ باز، لُترے، خیر سے روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، حق مارنے والے، سنگدل، مزید براں بے نسب کی۔ یہ کردار اس وجہ سے ہوا کہ وہ مال و اولاد والا ہے۔ جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہم عنقریب

اس کے ناک کے پر داغیں گے۔ ۸-۱۶

ہم نے ان کو اس طرح امتحان میں ڈالا ہے جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا جب کہ انھوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح سویرے ضرور ہی اس کے پھل توڑلیں گے اور کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ تو ابھی وہ سوئے پڑے ہی تھے کہ اس پر تیرے رب کی طرف سے گردش کا ایک جھونکا آیا تو وہ کٹی ہوئی فصل کے مانند ہو کر رہ گیا۔ صبح کو انھوں نے پکارا کہ پھل توڑنے ہیں تو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔ پس وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ دیکھنا آج باغ میں کوئی مسکین نہ گھسنے پائے اور وہ بڑے عزم و حوصلہ سے نکلے۔ پس جب اس کو دیکھا تو بولے کہ ہم تو راستہ بھول گئے! نہیں، بلکہ ہم تو محروم ہو کے رہ گئے! ان میں جو شخص کچھ معقول تھا اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ رب کی تسبیح کیوں نہیں کرتے! تب وہ پکارے، ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا ہائے بدبختی! ہم ہی سرکشی میں مبتلا رہے! توقع ہے کہ ہمارا رب اس کی جگہ اس سے بہتر باغ ہمیں دے۔ اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اسی طرح عذاب آجائے گا اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کاش! یہ لوگ اس کو جانتے! ۱۷-۳۳

بے شک متقیوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کردیں گے! تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے! کیا تمھارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں قیامت تک باقی رہنے والی کہ تمھارے

لیے وہی کچھ ہے جو تم فیصلہ کروگے! ان سے پوچھو، ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے، کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں؟ تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو اگر وہ سچے ہوں! ۴۱-۳۴

اس دن کو یاد رکھو جس دن ہلچل پڑے گی اور یہ لوگ سجدے کے لیے بلائے جائیں گے تو یہ نہ کرسکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔ ان پر ذلت طاری ہوگی اور یہ سجدے کے لیے اس وقت بھی بلائے جاتے تھے جب وہ صحیح سالم تھے۔ ۴۲-۴۳

پس چھوڑو مجھ کو اور ان کو جو اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں وہاں سے جہاں سے وہ نہیں جانتے۔ اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں بے شک میری تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ ۴۴-۴۵

کیا تم ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہو کہ وہ اس کے تاوان سے دبے جا رہے ہوں! یا ان کے پاس غیب کا علم ہے پس وہ اس کو لکھ رہے ہیں تو اپنے رب کے فیصلہ تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ بن جائیو! جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور وہ غم سے گھٹا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کا فضل اس کی دست گیری نہ کرتا تو وہ مذمّت کیا ہوا چٹیل میدان ہی میں پڑا رہ جاتا۔ پس اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا اور اس کو نیکوکاروں میں سے بنایا۔ ۴۶-۵۰

اور یہ کافر جب یاددہانی سنتے ہیں تو اس طرح تمھیں دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں لاریب یہ ایک دیوانہ ہے، حالانکہ یہ عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ ۵۱-۵۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۱)

حرف 'نٓ' کے معنی

جس طرح 'قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' (قٓ - ۵۰ : ۱) میں 'قٓ' سورہ کا نام ہے اسی طرح یہاں 'نٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق مبتدا یہاں حذف ہوگیا ہے جس کو ہم نے ترجمہ میں کھول دیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس نظریہ کا حوالہ ہم دے چکے ہیں کہ ابتداءً یہ حروف معانی پر دلیل ہوتے تھے، اب ان کے معانی کا علم اگرچہ باقی نہیں رہا تاہم بعض حروف اب بھی معنی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں استاذ امامؒ نے جن حروف کا حوالہ دیا ہے ان میں یہ حرف بھی شامل ہے۔ جو اب بھی اپنے قدیم معنی (مچھلی) میں مستعمل ہے۔ اس سورہ کو اس نام سے موسوم کرنے میں اشارہ ہے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا، چنانچہ سورہ کے آخر میں 'صَاحِبُ الْحُوْتِ' (مچھلی والے) کے لقب سے آنجنابؑ کا ذکر آیا بھی ہے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ میں 'ذَا النُّوْنِ' کے لقب سے بھی آپ کو ملقب فرمایا گیا ہے جس کے معنی بعینہٖ وہی ہیں جو 'صاحب الحوت' کے ہیں۔

قلم کی شہادت تین دعاوی پر

'وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ' یہ 'وَ' قسم کے لیے ہے اور یہ بات ہم بار بار ظاہر کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں کسی دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں۔ یہاں دعوے کے طور پر، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، تین باتیں مذکور ہیں جن کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسم کھائی گئی ہے۔

ایک یہ کہ مخالفین آپ کو (پیغمبر صلعم) جو دیوانہ کہتے ہیں یہ ان کی خود باختگی ہے۔ آپ دیوانے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے تمام فرزانوں سے بڑھ کر فرزانے ہیں۔

دوسری یہ کہ مخالفین جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی یہ ساری سرگرمیاں چند روزہ ہیں جو بہت جلد ہوا میں اڑ جائیں گی، یہ بالکل غلط ہے۔ آپ کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں ایک غیر منقطع اجر مقدر ہے۔

تیسری یہ کہ آپ ایک اعلیٰ کردار کے مالک ہیں اس وجہ سے جو لوگ آپ کو شاعر، کاہن یا دیوانہ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں وہ اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

ان دعاوی پر قرآن میں جگہ جگہ خود قرآن ہی کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے اس وجہ سے قرینہ اسی بات کا ہے کہ یہاں بھی 'وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ' سے قرآن ہی مراد ہو۔ چنانچہ مجاہدؒ سے روایت بھی ہے کہ 'الْقَلَمِ' سے مراد وہ قلم ہے جس سے قرآن مجید لکھا جا رہا تھا اور 'وَمَا يَسْطُرُوْنَ' سے مراد قرآن مجید ہے۔

قلم کی اہمیت کے چند پہلو

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'تعلیم بالقلم' اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے، 'اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ' (العلق - ۹۶ : ۳ - ۵) (پڑھو اور تمہارا رب نہایت ہی بافیض رب ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی، انسان کو سکھایا وہ کچھ

جو وہ نہیں جانتی تھا) سابق انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی وہ زبانی تعلیم کی شکل میں تھی جس کو محفوظ رکھنا نہایت مشکل تھا۔ وہ بہت جلد یا تو محرف ہو کر مسخ ہو جاتی یا اس پر نسیان کا پردہ پڑ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اس آفت سے محفوظ رکھنے کے لیے انسان کو قلم اور تحریر کے استعمال کا طریقہ سکھایا جس سے وہ اس قابل ہوا کہ زبانی تعلیم کی جگہ اس کو تحریر کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کو تورات کے احکام عشرہ الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ پھر دوسرے نبیوں کی تعلیمات بھی قلمبند ہوئیں اور سب کے آخر میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس طرح محفوظ کی گئی کہ قیامت تک اس میں کسی تحریف و تغیر کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی باقی نہ رہا۔

قلم سے مراد

'قلم' کی اسی اہمیت کے سبب سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے یہاں کوئی خاص قلم مراد نہیں ہے بلکہ یہ لفظ تعبیر ہے تعلیمات الٰہیہ کے اس پورے مدوّن سرمایہ (WRITTEN RECORD) کی جو قلم کے ذریعہ سے محفوظ ہوا۔ یعنی تورات، زبور، انجیل وغیرہ۔ ان مقدس صحیفوں کی تعلیمات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے اندر آپ کے ظہور کی ناقابل تردید شہادتیں بھی ہیں۔ ان ساری چیزوں کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔

'مَا يَسْطُرُوْنَ' کا مفہوم

'مَا يَسْطُرُوْنَ' سے مراد، قرینہ دلیل ہے کہ، قرآن مجید ہے جو اس وقت نازل بھی ہو رہا تھا اور صحابہؓ کے ہاتھوں لکھا بھی جا رہا تھا۔ پچھلے صحیفوں کی قسم کے بعد یہ خود قرآن مجید کی قسم ہے۔ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت، رزانت اور رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ جو شخص ایسا اعلیٰ اور برتر کلام پیش کر رہا ہے، اس کا یہ کلام ہی دلیل ہے کہ یہ کوئی کاہن یا شاعر یا دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کفار کے اس قسم کے طعنوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بالعموم قرآن مجید ہی کو ان کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ اس کو دیکھیں اور انصاف سے فیصلہ کریں کہ یہ کسی دیوانے یا کاہن یا شاعر کا کلام ہو سکتا ہے یا اللہ تعالیٰ کا؟

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۲)

قسم کا مقسم علیہ

یہ مقسم علیہ ہے۔ یعنی تمام پچھلے آسمانی صحیفے اور یہ قرآن، جو لکھا جا رہا ہے، سب اس بات پر شاہد ہیں کہ تم اللہ کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو۔ بلکہ تم انہی باتوں سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو جن سے آدم علیہ السلام سے لے کر مسیح علیہ السلام تک ہر نبی نے آگاہ کیا اور جن کی صداقت پر تاریخ گواہ ہے۔ اگر یہ مدعیان دانش اس جرم میں تمھیں دیوانہ کہہ رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو، تم دیوانے نہیں بلکہ اپنے رب کے سب سے بڑے فضل سے بہرہ مند ہو، البتہ ان دانش فروشوں کی عقل ماری گئی ہے کہ یہ دیوانے اور فرزانے میں امتیاز سے قاصر ہیں۔

آنحضرت صلعم کو مجنون کہنے کی وجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے کی وجہ ہم اس کے محل میں ظاہر کر چکے ہیں کہ قریش کے لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آپ جس عذاب سے ان کو اس تشدد و مد اور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرا رہے ہیں کہ گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں آخر وہ کدھر سے آ جائے گا؟ ان کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ آپ کے لب و لہجہ میں جو غیر معمولی جزم و یقین، آپ کے اندازِ دعوت میں جو مافوق العادت بے چینی و بے قراری اور آپ کی تذکیر میں دلوں کو ہلا دینے والی جو دردمندی و شفقت ہے اس سے ان کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ اس اثر کو زائل کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ اس شخص کی یہ ساری بے چینی و بے قراری اس وجہ سے نہیں ہے کہ فی الواقع کوئی عذاب آنے والا ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بھیجا ہے بلکہ بعض اشخاص کو جس طرح کسی چیز کا مالیخولیا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسی کی رٹ لگاتے رکھتے ہیں اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا مالیخولیا ہو گیا ہے جو اس کو ہر طرف سے آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس بات کو تقویت دینے کے لیے اس پر وہ یہ اضافہ بھی کر دیتے کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کے سبب سے اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ (۳)

رسولؐ کے لیے ابدالآباد اجر کی بشارت

یہ اسی بات کی وضاحت مثبت پہلو سے ہے کہ احمق ہیں وہ جو تمھیں دیوانہ سمجھ کر تمھارے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں جو ان کے خیال میں تمھیں تباہ کر دے گی۔ تباہی تمھارے لیے نہیں بلکہ خود ان کے لیے مقدر ہے۔ تمھارے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور مغروروں کو جو دنیا ملی ہے اور جس پر یہ نازاں ہیں یہ اب عذاب کی زد میں ہے اور بہت جلد یہ اس کا انجام دیکھ لیں گے لیکن تمھیں تمھاری حق پرستی کا جو صلہ ملنے والا ہے وہ ابدی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔

'غَيْرُ مَمْنُونٍ' کے معنی غیر منقطع کے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اس سے مختلف بھی لیے ہیں لیکن وہ عربیت اور نظائر قرآن کے خلاف ہے۔

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۴)

رسولؐ کا کردار اس کے دعوے پر عظیم حجت ہے

یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کی تاریخ نے اعلیٰ کردار کے جو نمونے پیش کیے ہیں تم اسی کی ایک نہایت شاندار مثال ہو اور تمھارا یہ کردار ان لوگوں کے خلاف سب سے بڑی حجت ہے جو تمھیں دیوانہ یا کاہن یا شاعر کہہ کر اپنے کو اور اپنے عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ تمھاری یہ باتیں ہوا میں اڑ جائیں گی۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ کردار کو آپ کے دعوے کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء میں نہایت تفصیل سے کاہنوں اور شاعروں کے اخلاق کی پستی، ان کی فکری ہرزہ گردی اور ان کے قول و عمل کی بے ربطی کا حوالہ دے کر ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ناپاک زمرے میں شامل کرتے تھے۔ ان سے سوال کیا گیا ہے کہ نبی کے اعلیٰ کردار کو ان کاہنوں اور شاعروں کے کردار سے کیا تعلق جن کا ظاہر و باطن دونوں ہی یکساں تاریک ہے!

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۝ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ (۵-۶)

اہلِ ایمان کے لیے بشارت اور مخالفوں کے لیے وعید

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے دھمکی ہے کہ اگر یہ تمھیں دیوانہ کہہ کر تمھاری باتوں کو بے وزن بنانا چاہتے ہیں تو کچھ دن صبر کرو۔ عنقریب تم بھی دیکھ لو گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ دونوں میں سے کس پارٹی کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈر کے ہاتھ میں ہے؟ اہلِ ایمان کی باگ، جن کی قیادت تم کر رہے ہو یا قریش کی باگ جن کی قیادت ابولہب اور ابوجہل کر رہے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے اور حقیقت کے ظاہر ہونے میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ بہت جلد سب دیکھ لیں گے کہ کون لوگ شیطان کے فتنہ میں پڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی قوم کو تباہی کے کھڈ میں گرایا اور کون شیطان کے فتنوں سے امان میں رہا اور اس نے اپنے پیروؤں کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہ دکھائی!

یہاں وہ حقیقت پیش نظر رکھیے جس کی بار بار یاد دہانی کی جا چکی ہے کہ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب وہ آتے ہیں تو اسی دنیا میں اپنی جماعت اور اپنے مخالفوں کے انجام کا فیصلہ کر کے جاتے ہیں۔ آیت میں اہلِ ایمان کے لیے جو تسلی اور اہلِ کفر کے لیے جو وعید ہے وہ جس طرح آخرت سے متعلق ہے اسی طرح اس دنیا سے بھی متعلق ہے۔ سابق سورہ کے آخر میں جو فرمایا ہے کہ 'فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ' یہ اسی کا اعادہ دوسرے الفاظ میں ہے۔

'بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ' میں 'ب' بظاہر 'تُبْصِرُ' اور 'يُبْصِرُونَ' کے ساتھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہاں تضمین ہے یعنی 'يُبْصِرُونَ' متضمن ہے 'يَعْلَمُونَ' کے معنی پر مجھے یاد پڑتا ہے کہ زمخشری کی رائے یہی ہے اور میرے نزدیک یہ رائے اصولِ عربیت کے مطابق ہے۔ 'بِأَيِّكُمُ' کے معنی 'بِأَيِّ الْحِزْبَيْنِ' کے ہیں۔

'مَفْتُونٌ' کے معنی 'مَجْنُونٌ' کے نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ 'مَفْتُونٌ' ہی کے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو دنیا اور شیطان کے جال میں پھنسا ہوا ہو۔ یہاں 'مجنون' کے بجائے 'مفتون' کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہ رہنمائی دی ہے کہ جو لوگ دنیا اور شیطان کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اصلی مجنون وہی ہوتے ہیں اور جس پارٹی کی باگ ایسے مفتونوں کے ہاتھ میں ہو وہ بالآخر جہنم میں گر کے رہتی ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۝ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۷)

یہ اسی اوپر والے مضمون کی تائید و توثیق ہے کہ تمھارا رب نہ تو ان لوگوں سے بے خبر ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور نہ ان لوگوں سے ناواقف ہے جو ہدایت پر ہیں بلکہ وہ دونوں

ہی سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ نہ یہ ہو سکتا کہ جو ذلت کے مستحق ہیں وہ ہمیشہ عزت سے سرفراز رہیں اور نہ یہ ہو سکتا کہ جو سرفرازی کے حق دار ہیں وہ برابر ظالموں کے ظلم کے ہدف بنے رہیں۔ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ یہ ایک علیم و خبیر خالق کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک روز انصاف آئے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اس رب پر بھروسہ رکھو۔ وہ نیکوکاروں اور شریروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۸)

یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی تو عذاب اور قیامت کی تکذیب کرنے والوں کی باتوں کا دھیان نہ کرو اور ان کی ہفوات پر کان نہ دھرو۔ یہ لوگ اگر مگن ہیں کہ نہ عذاب ہے نہ قیامت تو انھیں مگن رہنے دو۔ اگر یہ مطمئن ہیں کہ قیامت ہوئی تو وہاں بھی ان کو وہی کچھ حاصل ہوگا جو یہاں حاصل ہے تو انھیں یہ خواب خوش دیکھ لینے دو۔ یہ دنیا ان کی خواہشوں کے محور پر نہیں گھوم رہی ہے کہ جو کچھ یہ چاہیں گے انھیں مل جائے گا بلکہ یہ ایک حکیم و عزیز کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے اور یہ لازم ہے کہ ایک دن اس کی حکمت اور اس کا عدل اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو۔

لفظ 'اطاعۃ' یہاں کسی کی بات کا اثر لینے کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ کلام عرب میں بھی استعمال ہوا ہے اور قرآن میں بھی۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۹)

مخالفین کی اصل پالیسی

یہ ان مکذبین کی مخالفت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی یہ ساری تگ و دو اس مقصد سے ہے کہ تم کچھ اپنے رویہ میں لچک پیدا کرو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں۔ یعنی تمھاری باتوں کی صداقت میں انھیں شبہ نہیں ہے لیکن ان کو ماننا ان کی خواہشوں کے خلاف ہے اس وجہ سے انھوں نے یہ طوفان اٹھایا ہے کہ تم پر دباؤ ڈال کر تمھیں کچھ نرم کریں تاکہ تم کچھ باتیں ان کی مان لو اور وہ کچھ باتیں تمھاری مان لیں اور اس طرح کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر باہم سمجھوتہ ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ مخالفت اپنے دین جاہلی کے ساتھ کسی اخلاص پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک قسم کی (BARGAINING) کی کوشش ہے۔ جب تک انھیں توقع ہے کہ وہ تمھیں دبانے میں کچھ کامیاب ہو جائیں گے ان کی یہ کوشش جاری رہے گی۔ جب یہ توقع ختم ہو جائے گی ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔

زبان سے متعلق ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال زبان سے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ عربیت کے قاعدے سے تو یہاں 'وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْا' ہونا تھا لیکن ہے 'فَيُدْهِنُوْنَ'۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اسلوب مختلف اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں دراصل مبتدا محذوف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل میں 'فَهُمْ يُدْهِنُوْنَ' ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان کی خواہش یہ ہے کہ جب تم کچھ نرم پڑ جاؤ گے تو وہ بھی

اپنے رویہ میں نرمی پیدا کرلیں گے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (۱۰)

قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی تصویر

یہ اسی 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ' پر عطف کر کے تاکید کے ساتھ پھر تنبیہ فرمائی کہ تم ہر لپاٹیے ذلیل کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی پستی کی تصویر آگے کی چند آیتوں میں کھینچ دی گئی ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف پیغمبر کا وہ بے مثال 'خلقِ عظیم' ہے جس کا آیت ۴ میں حوالہ ہے اور دوسری طرف قریش کے لیڈروں —— ابولہب، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، اخنس بن شریق —— وغیرہ کا یہ کردار ہے جو بیان ہو رہا ہے۔ ان دونوں کو سامنے رکھ کر ہر منصف فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے!

یہ بات کہ یہ کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہو رہا ہے مختلف پہلوؤں سے واضح ہے۔

اول یہ کہ اس کا عطف 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ' پر ہے اور مکذبین سے مراد ظاہر ہے کہ کوئی معیّن شخص نہیں بلکہ موقع و محل دلیل ہے کہ قریش کی پوری قیادت ہے۔

دوسرا یہ کہ لفظ 'کُلّ' بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں زیر بحث کسی معیّن شخص کا کردار نہیں بلکہ جماعت کا کردار ہے۔

تیسرا یہ کہ آگے 'اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جس میں جمع کی ضمیر 'هُمْ' اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مرجع کوئی فرد نہیں بلکہ جماعت ہے۔

چوتھا یہ کہ یہاں جو کردار بیان ہوا ہے وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے لیکن ہر بات کسی ایک معیّن شخص پر اگر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔

اس اصولی بحث کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب الفاظ پر غور فرمائیے۔

'حلّاف'

'حَلَّافٍ' کے معنی بہت زیادہ قسم کھانے والے کے ہیں۔ لفظ 'حلف' جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اول تو اچھے معنی میں آتا نہیں پھر اس کے ساتھ 'مَهِينٍ' کی صفت بھی لگی ہوئی ہے جس کے معنی ذلیل کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زیادہ قسم وہی شخص کھائے گا جس کو اپنی عزتِ نفس کا خیال نہیں ہو گا۔ جو لوگ کردار کے اعتبار سے پست یا مطعون ہوتے ہیں وہ ہمیشہ احساسِ کہتری کے سبب سے شک میں مبتلا رہتے ہیں کہ مخاطب ان کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ قسم کھا کے اطمینان نہیں دلائیں گے اس وجہ سے وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں۔ چنانچہ منافقین کے متعلق قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے کردار پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ قریش کے لیڈروں کے پاس نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر حرف رکھنے کی گنجائش تھی اور نہ اسلام کے خلاف کوئی

مبنی بردلیل بات کہنے کی۔ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے واحد سہارا ان کے پاس یہی تھا کہ قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو اطمینان دلائیں کہ العیاذ باللہ آپ شاعر، کاہن، مجنون اور مفتری ہیں۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ (۱۱)

هَمَّازٍ — 'هَمَّازٍ' 'همز' سے مبالغہ ہے جس کے معنی اشارہ باز کے ہیں۔ اشارہ بازی اور پھبتی اس قسم کے لوگوں کا خاص شیوہ ہوتا ہے جو کسی کو دوسروں کی نگاہوں سے گرانے کے درپے ہوں۔ یہ اشارہ بازی حرکات اور چشم و ابرو سے بھی ہوتی ہے، الفاظ اور فقروں سے بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور غریب مسلمانوں کو قریش کے متکبرین جس قسم کے اشاروں اور فقروں کا ہدف بناتے تھے اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ 'وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ' (الھمزۃ - ۱۰۴ : ۱) میں اسی کردار کی طرف اشارہ ہے۔ متکبرین کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ اسی اوچھے ہتھیار سے حق کو شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس قسم کے تر تکے حقیقت کی شمشیرِ براں کے مقابل میں کیا کام آسکتے ہیں!

مَشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ — 'مَشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ'۔ 'نميمة' اور 'نميم' کے معنی چغلی اور لگانے بجھانے کے ہیں۔ یہ اشارہ ان مفسدین کے جوڑ توڑ کی خصلت کی طرف ہے کہ یہ رات دن جوڑ توڑ میں سرگرم رہتے ہیں اور اس کے ذریعے چغلی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ جس کو بھی دوسرے سے کاٹنا اور اپنے سے ملانا چاہا تو اس کے لیے سب سے بڑا حربہ ان کے پاس یہی ہوتا ہے۔

اسی نسخہ سے وہ اسلام کی مخالفت کا کام بھی لے رہے تھے۔ ان کی رات دن یہی کوشش تھی کہ مختلف قسم کی بے بنیاد غلط فہمیاں مسلمانوں میں پھیلا کر ان کے درمیان پھوٹ ڈلوائیں تاکہ اسلام نے ان کے اندر جو اخوت و مودت پیدا کی ہے وہ مستحکم نہ ہونے پائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (۱۲)

مناع، معتدی اور اثیم — اوپر کی آیات سے واضح ہوا کہ ان کی قیادت کی پوری عمارت جھوٹ، دوسروں کی تحقیر و توہین اور چغلی و نمامی پر قائم ہے۔ اب یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نیکی کے کٹر دشمن، اللہ کے حدود کو توڑنے والے، ابندوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور ان کو دبا بیٹھنے والے ہیں۔

'مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ' یوں تو عام ہے کہ وہ ہر نیکی اور بھلائی کی راہ میں ایک بھاری پتھر ہیں لیکن یہاں خاص اشارہ ان کی بخالت کی طرف ہے کہ وہ غربا و مساکین کی امداد میں نہ خود کوڑی خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے اور نہ دوسروں کو خرچ کرتے دیکھ سکتے بلکہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی انہی کی طرح مارِ گنج بنے بیٹھے رہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔ قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بخیلوں کے کردار کا یہ پہلو واضح فرمایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بخالت کی راہ سجھاتے ہیں تاکہ خود ان کی بخالت کا راز فاش نہ ہو۔

'مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ' یعنی صرف یہی نہیں کہ نہ خود خرچ کرتے نہ خرچ کرنے دیتے بلکہ وہ دوسروں کے حقوق پر تعدی کرنے والے بھی ہیں اور جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھنے والے بھی۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'اعتداء' میں دوسروں کے حقوق پر دست درازی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'اثم' میں حق تلفی کا۔

'عُتُلٍّ'

عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۱۳)

'عُتُلٍّ' کے معنی سخت دل اور بے مروّت کے ہیں۔ جو شخص بخیل ہو گا وہ لازماً سنگ دل بھی ہو گا۔ یہ گویا اوپر کے بیان کردہ کردار کا باطنی پہلو ہے۔ انہی لوگوں کے باب میں ارشاد ہوا ہے: 'اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ' (الماعون ۱۰۷: ۱-۲) (ذرا دیکھو تو اس کو جو جزاء کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے)۔

'زنیم'

'بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ'۔ 'زنیم' کی وضاحت اہل لغت نے یوں کی ہے: الملحق بقوم ليس منهم ولا يحتاجون اليه (وہ شخص جو کسی قوم کے نسب میں شریک بن بیٹھے درآنحالیکہ نہ وہ ان میں سے ہو اور نہ اہل قوم اس کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہوں) یہ لفظ 'زنمۃ' سے نکلا ہے۔ 'زنمۃ' اس غدود کو کہتے ہیں جو بعض بکریوں کی گردن میں لٹک آتا ہے اور جس کی حیثیت جسم میں ایک بالکل فالتو عضو کی ہوتی ہے۔ روایات میں اخنس بن شریق کے متعلق آیا ہے کہ اصلاً وہ ثقیف میں سے تھا لیکن مدعی تھا کہ وہ زہرہ میں سے ہے۔ اسی طرح ولید بن مغیرہ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ قرشی ہونے کا مدعی تھا حالانکہ وہ قریش میں سے نہ تھا۔ جو لوگ اپنے نسب کو حقیر سمجھ کر دوسروں کے نسب میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں وہ شیخی باز قسم کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا زیادہ اعتماد تملق، چاپلوسی اور قومی حمیّت و حمایت کی جھوٹی نمائش پر ہوتا ہے تاکہ قوم کے اندر ان کا بھرم قائم رہے۔ چنانچہ اس طرح کے کھوٹے قرشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں خاص طور پر پیش پیش تھے۔ وہ اپنی قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو اکساتے کہ آپ کی دعوت سے قریش کی وحدت و جمعیت میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ انہی شیخی بازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا کہ اور رذالتیں ان کے اندر جو تھیں وہ تو تھیں ہی مزید برآں یہ بھی ہے کہ ان میں کچھ طفیلی بھی ہیں جو اہل قوم سے بھی زیادہ قوم کے وفادار ہونے کے مدعی اور اس کی جاہلی روایات کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کڑوے کریلے تو تھے ہی ستم بالائے ستم یہ ہوا ہے کہ یہ نیم چڑھے بھی ہیں۔ قرآن نے یہ ضرب اس کردار پر لگائی ہے جو اس قسم کے لوگوں کے اندر لازماً پیدا ہو جاتا ہے جو احساس کہتری کے مریض اور خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ (۱۴)

فاسد کردار کا سبب

یہ سبب بیان ہوا ہے اس بات کا کہ ان کے اندر یہ کردار کیوں پیدا ہوا۔ فرمایا کہ اس وجہ سے پیدا

ہوا کہ یہ مال و اولاد والے ہوئے ۔ یہ فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کو مال و اولاد والا بنایا تو ہونا تو یہ تھا کہ یہ اپنے رب کے شکر گزار، فرمانبردار اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کے علمبردار بن کر اٹھتے لیکن یہ اس کے برعکس بالکل ناشکرے اور نابہنجار بن کر اٹھے ۔ قرآن میں یہ حقیقت جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جن کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند فرماتا ہے وہ ان کا امتحان کرتا ہے کہ دیکھے اس کی نعمتیں پاکر وہ اس کے شکر گزار بنتے ہیں یا غرور میں مبتلا ہو کر شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں ۔ اسی امتحان میں اللہ نے ان لوگوں کو ڈالا لیکن یہ بالکل فیل ہو کر رہ گئے اور اللہ کی نعمت ان کے لیے نقمت کا سبب بن گئی۔

اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ (۱۵)

غرور و استکبار کی تصویر

یہ اس غرور و استکبار کی تصویر ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہوئے ۔ فرمایا کہ جب ان کو ان قوموں کی سرگزشتیں سنائی جاتی ہیں جو انہی کی طرح غرور و استکبار میں مبتلا ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں تباہ کر دی گئیں تو ان سے سبق لینے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ تو پچھلی قوموں کے فسانے ہیں، ان کو حاضر سے کیا تعلق! مطلب یہ کہ اس قسم کے قصے سنانے والوں کو نہ ہم نبی ماننے کے لیے تیار ہیں اور نہ ان افسانوں سے ہم مرعوب ہی ہونے والے ہیں ۔ اس امر کو کسی کی تصدیق یا تکذیب سے کیا تعلق!

سَنَسِمُہٗ عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ (۱۶)

استکبار کی سزا

یہ ان متکبرین کے غرور و استکبار کی سزا بیان ہوئی ہے جو آخرت میں ان کو ملنے والی ہے ۔ فرمایا کہ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب ہم ان کے ناک ڑے پر داغ لگائیں گے ۔ 'خرطوم' اصل میں سونڈ کو کہتے ہیں ۔ یہاں یہ متکبرین کی ناکوں کے لیے بطریق استعارہ استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت درحقیقت اپنی ناک ہی اونچی رکھنے کے لیے کر رہے تھے ۔ اگر کسی کے اندر ناک اونچی رکھنے کا ایسا جنون پیدا ہو جائے کہ وہ اس کی خاطر بڑے سے بڑے اور واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ناک صرف ناک نہیں ہے بلکہ اس نے اس کو بڑھا کر اور پھلا کر سونڈ بنا لیا ہے ۔ فرمایا کہ اگر انھوں نے اپنی ناک کو ناک ڑا بنا لیا ہے تو بنا لیں، ہم عنقریب ان کے ناک ڑے پر ذلت کا داغ لگائیں گے جو سب دیکھیں گے ۔ یہ استکبار اور اس کی سزا کی بہترین تعبیر ہے جس کی بلاغت احاطۂ بیان میں نہیں آ سکتی ۔

اِنَّا بَلَوۡنٰہُمۡ کَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَیَصۡرِمُنَّہَا مُصۡبِحِیۡنَ (۱۷)

قریش کے لیڈروں کے لیے ایک تمثیل

اوپر قریش کے قائدین کا جو کردار بیان ہوا ہے اس کا کھوکھلا پن واضح کرنے کے لیے یہ ان کے سامنے ایک تمثیل بیان فرمائی ہے جس میں ان کو یہ دکھایا ہے کہ اپنے جس اقتدار پر ان کو یہ ناز و اعتماد ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کی بنیاد بالکل ریت پر ہے اللہ تعالیٰ

جب چاہے گا چشم زدن میں اس کو خاک میں ملا دے گا۔ اس وقت وہ اپنی بدبختی پر سر پیٹیں گے اور توبہ و استغفار بھی کریں گے لیکن ان کا سارا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔

'بَلَوْنٰهُمْ' میں ضمیر 'هُمْ' کا مرجع ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہوں گے جن کا کردار اوپر زیر بحث آیا ہے۔ یہ اس بات کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت واضح قرینہ ہے کہ یہ کردار کسی معین شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا ہے۔ اگر کسی ایک شخص کا کردار بیان ہوا ہوتا تو ضمیر جمع کی جگہ واحد کی آتی۔

اسی طرح یہاں زبان کا ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ 'اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ' میں لفظ 'الْجَنَّة' پر الف لام داخل ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص باغ والوں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمثیلات میں لام تعریف یا 'اَلَّذِیْ' اور 'اَلَّتِیْ' وغیرہ جو آتے ہیں تو اس سے مقصود، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع میں وضاحت کر چکے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کوئی معین ذات مدنظر ہے بلکہ اس سے مقصود صرف صورت حال کو مشخص و مصوّر کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری کے سامنے واقعے کی پوری تصویر آ جائے۔ اس وجہ سے یہاں یمن یا صنعار کے کسی خاص باغ کے مالکوں کے واقعہ کی جستجو کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے اٹھائی ہے، بلکہ یہ ایک خاکہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں کے ذہن اور ان کے انجام کی تصویر اس طرح کھینچ دی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔

'اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِیْنَ' یہ اس اعتماد کی طرف اشارہ ہے جو باغ والوں کو اپنی کامیابی پر تھا۔ وہ نہایت مطمئن اور پُرامید تھے کہ ان کا باغ موسموں کے تمام تغیرات سے گزر کر اب اس مرحلہ میں داخل ہو گیا جس میں اس پر کسی آفت کا کوئی اندیشہ نہیں رہا۔ ان کے خیال میں بس اتنا کام باقی رہ گیا تھا کہ کل صبح وہ جائیں اور پھل توڑ کر اپنے گھروں کو لائیں۔ چنانچہ انھوں نے قسم کھا کر یہ ارادہ کیا کہ صبح ہم اس کے پھل ضرور ہی توڑ لیں گے۔

وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ (۱۸)

ایک عام غلط فہمی

عام طور پر لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ قسم کھاتے ہوئے انھوں نے 'اِنْ شَآءَ اللّٰهُ' نہیں کہا۔ ان کو اپنی کامیابی اتنی متیقن نظر آئی کہ یہ وہم بھی نہ گزرا کہ اس میں کوئی رخنہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مطلب پر اگرچہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے لیکن میرا دل اس پر نہیں جمتا۔ لفظ 'اِسْتِثْنَآءُ' کے اندر اگرچہ اس مفہوم کی گنجائش ہے لیکن جس اسلوب میں یہاں بات فرمائی گئی ہے وہ اس کے لیے کچھ موزوں نہیں ہے۔ اگر یہ بات کہنی تھی تو 'وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ' کی جگہ 'وَلَمْ یَسْتَثْنُوْا' یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور اسلوب ہونا تھا۔ خود لفظ 'اِسْتِثْنَآءُ' بھی 'اِنْ شَآءَ اللّٰهُ' کہنے کے مفہوم کے لیے کوئی واضح لفظ نہیں ہے۔

اس کا یہ مطلب جہاں بھی لیا جائے گا قرینہ ہی کی مدد سے لیا جائے گا۔ اور یہاں اس کا قرینہ ایسا واضح نہیں ہے کہ اس پر ذہن پوری طرح مطمئن ہو سکے۔

میرے نزدیک یہاں 'وَلَا یَسۡتَثۡنُوۡنَ' اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں ہے یعنی انھوں نے قسم کھائی کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور ہی توڑ لیں گے اور اس میں سے کچھ بھی چھوڑیں گے نہیں۔ مطلب یہ کہ ہم ان لوگوں کا طریقہ نہیں اختیار کریں گے جو باغ کے پھل توڑتے ہیں تو کچھ غریبوں مسکینوں کے نام پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ باغوں سے متعلق دین دار اور فیاض لوگوں کے اندر یہ طریقہ قدیم زمانہ سے معروف چلا آ رہا ہے کہ جب باغ کے پھل توڑتے تو کچھ حصہ مسکینوں کے حق کے طور پر چھوڑ دیتے۔ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم مذکور ہے کہ جب تو اپنے باغ کے پھل توڑے تو کل نہ توڑ لے بلکہ اس کا کچھ حصہ غریبوں اور مسکینوں کے لیے بھی چھوڑ۔ اسی معروف طریقہ کو پیش نظر رکھ کر ان لئیموں نے قسم کھائی کہ ہم ایسا ہرگز کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو اپنی اسی بات کو مؤکد کرنے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت پڑی ورنہ جملہ میں قسم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس تمثیل میں چونکہ قریش کے ان لیڈروں کا کردار نمایاں کیا جا رہا ہے جن کو اوپر 'مَنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ'، 'عُتُلٍّۭ' اور 'اَثِیۡمٍ' کہا گیا ہے اس وجہ سے باغ والوں کی مذکورہ بالا قسم کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا تاکہ دونوں کے کردار کی مشابہت پوری طرح واضح ہو جائے۔ قرآن میں ابولہب اور اس کے ہم مشربوں کی بخالت کی جو تصویر جگہ جگہ کھینچی گئی ہے اس کو بھی یہاں ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

فَطَافَ عَلَیۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ۞ فَاَصۡبَحَتۡ كَالصَّرِیۡمِ (۱۹-۲۰)

یعنی مذکورہ فیصلہ بڑے عزم و جزم اور بڑی تاکید و قسم کے ساتھ کر کے وہ رات میں سوئے لیکن ابھی سوتے ہی پڑے تھے کہ ان کے باغ پر کوئی خدائی گردش ایسی آئی جس نے باغ کا ستھراؤ کر دیا اور وہ بالکل کٹی ہوئی فصل کے مانند ہو کر رہ گیا۔ 'طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ' میں گردش کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہ بالکل بے سان گمان نمودار ہوئی، دوسری اس کی بے پناہی کی طرف کہ اس نے چشم زدن میں وہ کرشمہ کر دکھایا کہ ہرا بھرا باغ بے نشان ہو کر رہ گیا۔

'مِّنۡ رَّبِّكَ' میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تسلی کے لیے ہے۔ ابتدائی آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آج تم ان کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو تو وہ اپنے ظاہری حالات کو بالکل ہموار و سازگار دیکھ کر تمھیں دیوانہ کہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ بھلا ان پر عذاب کدھر سے آ جائے گا؟ اس تمثیل میں دکھا دیا کہ تیرے رب کا عذاب جب آتا ہے تو یوں آتا ہے کہ منصوبہ بندی کرنے والے سارے منصوبے، عہد و قسم کے ساتھ، بناکے سوتے ہی

لیکن جب صبح کو اٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۙ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ (۲۱-۲۲)

یہ لوگ ساری اسکیم بنا کے رات میں سوئے اور صبح اٹھتے ہی تمام شرکا نے ہانک پکار مچائی کہ پھل توڑنے اور فصل اٹھانی ہے تو سویرے سویرے اپنے کھیتوں پر پہنچو۔ 'حَرْث' اگرچہ کھیتی کے معنی میں آتا ہے لیکن اس سے مراد وہ باغ ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے آرہا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ عرب میں باغوں ہی کے اندر مختلف چیزوں کی کاشت کے لیے قطعات بھی ہوتے تھے اس وجہ سے ان کو باغ (جنت) بھی کہہ سکتے تھے اور کھیتی (حرث) بھی۔

'اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ' کے الفاظ شرکاء کو للکارنے اور آمادہ کرنے کے لیے ہیں۔ یعنی یہ کاٹ ہے تو وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً چلو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ (۲۳-۲۴)

یعنی گھر سے نکلے تو چپکے چپکے ایک دوسرے کو ہوشیار کرتے ہوئے نکلے کہ خیال رکھنا، آج کے دن کوئی فقیر نہ باغ میں گھسنے پائے۔ یہ ان کی اسی خست کی تعبیر دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر 'وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ (۲۵)

لفظ 'حَرْد' کے اندر تیز گامی، جوش، امنگ اور نشاط کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غریبوں اور مسکینوں کے تعاقب سے بچنے کا پورا سامان کر کے وہ بڑے حوصلہ اور پورے اعتماد کے ساتھ باغ کی طرف چلے۔ 'قٰدِرِيْنَ' یعنی ان کے دل اعتماد و حوصلہ سے معمور تھے کہ اب کیا اندیشہ ہے، باغ اپنا ہے اور پھل تیار ہے، اب ہمارے ارمانوں میں کون خلل انداز ہو سکتا ہے! غریبوں، مسکینوں کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا سو اس کا بھی سدباب کر لیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۲۶-۲۷)

یعنی جب باغ پر نظر پڑی تو گردش آسمانی نے اس کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیا تھا کہ پہلے وہلے میں اس کو پہچان نہ سکے۔ خیال ہوا کہ شاید اندھیرے میں کسی اور سمت میں نکل آئے۔ بولے کہ ارے! ہم تو راستہ بھول گئے۔ لیکن پھر اصل حقیقت سامنے آئی کہ راستہ نہیں بھولے ہیں بلکہ باغ ہی اجڑ گیا ہے تب نہایت حسرت کے ساتھ بولے کہ یہ تو ہم بالکل ہی محروم ہو کے رہ گئے! ہم کن ارمانوں اور حوصلوں کے ساتھ گھر سے نکلے لیکن یہاں تو خاک نہیں!

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ (۲۸)

"اَوْسَطُهُمْ" سے مراد ان کے اندر کا سب سے زیادہ میانہ رو اور معقول آدمی۔ بڑے سے بڑے معاشرے کے اندر بھی بعض سعید روحیں ہوتی ہیں جو لوگوں کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکتی رہتی ہیں خواہ غفلت کے متوالے سنیں یا نہ سنیں۔ اسی طرح کا کوئی اللہ کا بندہ ان کے اندر بھی تھا جو وقتاً فوقتاً ان کو یاد دہانی کرتا رہتا تھا کہ اپنے رب سے غافل نہ رہو بلکہ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ لفظ 'تسبیح' ایک جامع کلمہ ہے جو اللہ کی یاد اور اس کی بندگی کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ پہلے تو اس کا وعظ ان سرمستوں پر کارگر نہ ہوا لیکن جب ان کی غفلت کا انجام ان کے سامنے آگیا تب ان کو اندازہ ہوا کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور یہ اللہ کا بندہ غلط نہیں کہتا تھا!

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۹)

فوراً بولے کہ لاریب ہمارا رب پاک ہے، یہ اس نے ہمارے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بنے کہ اپنی کامیابیوں کے نشہ میں اس کی شانوں کو بھول گئے اور اگر کسی نے ہمیں یاد دلانے کی کوشش کی تو سُنی ان سُنی کردی ——— یہ اسی طرح کا اعتراف ہے جس طرح کا اعتراف فرعون نے اس وقت کیا جب وہ اپنی فوجوں سمیت موجوں کی لپیٹ میں آگیا۔ اس طرح کی توبہ بعد از وقت ہونے کے سبب سے بالکل بے سود ہوتی ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ (۳۰-۳۱)

جب انجام سامنے آگیا تو سب ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ کسی نے کسی پر الزام لگایا کہ اس نے صحیح راہ اختیار کرنے نہ دی، کسی نے دوسرے کو مجرم ٹھہرایا کہ اس نے ناصح کی بات سننے نہ دی۔ جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے وہ اپنی بے عقلی کا انجام دیکھ لینے کے بعد اسی طرح ایک دوسرے کو ملعون کرتے ہیں حالانکہ مجرم سب ہی ہوتے ہیں۔ بس یہ فرق ہوتا ہے کہ کچھ فساد کی راہ کھولتے ہیں اور کچھ آنکھ بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں۔ بالآخر ان سب کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جرم میں شریک سب ہی ہیں۔

عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (۳۲)

یعنی ایک دوسرے پر لعن طعن اور اپنی نالائقی کا اعتراف کرنے کے بعد انھوں نے اس توقع کا بھی اظہار کیا کہ اب ہم اپنے رب کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اس باغ کی جگہ اس سے بہتر باغ ہمیں عطا فرمائے گا۔

یہاں قرآن نے ان کی اس توقع پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ وقت گزر جانے کے بعد جو لوگ توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درخور اعتنا نہیں ٹھہرتی۔

جس مقصد سے قریش کو یہ تمثیل سنائی گئی ہے بعینہٖ اسی مقصد سے اسی طرح کی ایک تمثیل سورہ کہف

آیات ۴۲ - ۴۳ میں سنائی گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۳۳)

تمثیل کے بعد قریش کو تنبیہ

تمثیل سنانے کے بعد یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اللہ کا رسول ان کو جس عذاب سے ڈرا رہا ہے وہ اسی طرح ان پر آدھمکے گا۔ آج وہ اپنے عیش میں مگن اور خدا کی پکڑ سے بالکل بے فکر ہیں۔ رسولؐ ان کو خطرہ سے آگاہ کر رہا ہے تو اس کو خبطی کہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ ان پر عذاب کدھر سے آجائے گا۔ وہ ادھر سے آئے گا جدھر سے اس کے آنے کا گمان بھی نہ ہوگا اور اس وقت ان کا وہی حال ہوگا جو باغ والوں کا ہوا لیکن اس وقت ان کا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔

'كَذٰلِكَ الْعَذَابُ' میں 'عذاب' سے اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق کسی قوم پر اس وقت آیا ہے جب اس نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی اور رسول اپنا فرضِ بلاغ ادا کر چکا ہے۔ یہ عذاب، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کر چکے ہیں، اس قوم کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کو عذابِ آخرت سے سابقہ پیش آئے گا جو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ اللہ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو ان دونوں ہی عذابوں سے ڈرایا ہے۔

'لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ' اظہارِ حسرت و افسوس کا جملہ ہے کہ عقل کے ان اندھوں کو آخرت بہت بعید از قیاس چیز معلوم ہوتی ہے حالانکہ وہ ایک حقیقت اور اس کا عذاب بڑا ہی ہولناک ہے۔ بشرطیکہ یہ جانیں اور سمجھیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۳۴)

نیکوکاروں کا انجام

متکبرین کا انجام بیان کر چکنے کے بعد یہ اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں آخرت کے حساب کتاب سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری ان کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ یہ 'مُتَّقِيْن' کا ذکر ان متکبرین کے مقابل میں ہوا ہے جو اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں خدا کی پکڑ اور آخرت کے عذاب سے بالکل بے فکر تھے۔ اس تقابل سے اس لفظ کے اصل مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی ظاہر فریبیوں میں گم نہیں ہو گئے ہیں بلکہ اس کے پس پردہ جو حقیقت ہے اس پر بھی ان کی نظر ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (۳۵)

نیک و بد میں امتیاز عدل الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے۔ فرمایا کہ ایسا ہونا خدا کے عدل اور اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیکوکار اور بدکار، وفادار اور غدار، بے ایمان اور ایمان دار دونوں

یکساں ہیں۔ یہ بات بالبداہت اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ صفات کے منافی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کی نظر میں نیک اور بد دونوں برابر ہوں۔

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (۳۶)

جزاء اور سزا کا انکار انسان کی فطرت اور عقل کے خلاف ہے

یہاں متکبرین سے بانداز تعجب سوال ہے کہ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تمھاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے کہ تم اس قسم کے فیصلے کرنے لگے ہو! مطلب یہ ہے کہ اگر تم آخرت اور جزاء و سزا نہیں مانتے، تمھارے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، یہ یونہی چلتی رہے گی یا یونہی ایک دن تمام ہو جائے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کے خالق کو عدل اور رحم کی صفات سے عاری سمجھتے ہو جس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ کس نے نیکی کی زندگی گزاری اور کس نے بدی کی۔ اگر تمھارا فیصلہ یہ ہے تو سوچو کہ یہ فیصلہ عقل اور فطرت سے کتنا بعید ہے! یہ کتنی بڑی تہمت ہے جو اس کائنات کے خالق پر، جس کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شہادت اس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے، تم لگا رہے ہو!

قرآن کے اس اندازِ سوال سے یہ بات صاف نمایاں ہے کہ انسان کی عام عقل اور اس کی عام فطرت اس فیصلہ کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ چیز دو شکلوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ محض اپنی خواہشوں سے بے بس ہو کر اپنی عقل کی آنکھوں میں دھول جھونکتے اور اپنی فطرت کو جھٹلاتے ہیں یا یہ کہ انھوں نے اپنی یہ دونوں صلاحیتیں بالکل برباد کر لی ہیں۔

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ (۳۷-۳۸)

متکبرین کے ایک مغالطہ پر ضرب

یہ قریش کے ان متکبرین کی ایک اور آرزوئے باطل پر ضرب لگائی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ آخرت واخرت اول تو کوئی چیز ہے نہیں اور ہے تو ہمیں جو کچھ یہاں حاصل ہے اس سے بہتر وہاں حاصل ہو گا۔ ان کے اس مغالطہ کی بنیاد اس واہمہ پر تھی کہ اگر وہ خدا کے منظورِ نظر نہ ہوتے تو یہ عزت و سیادت انھیں اس دنیا میں کس طرح حاصل ہوتی! تو جب خدا کے منظورِ نظر ہوئے تو جو کچھ انھیں یہاں حاصل ہے اس سے بڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔ فرمایا کہ تم کو اس مغالطہ میں کس چیز نے ڈالا؟ کیا تمھارے پاس خدا کا اتارا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمھاری ساری آرزوئیں پوری ہوں گی؟ مطلب یہ ہے کہ جس کی آرزوئیں تم نے اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں عقل و فطرت کے اندر تو ان کی کوئی بنیاد ہے نہیں، ہاں اگر کوئی آسمانی صحیفہ تمھارے پاس ہے جس میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں تو اس کو پیش کرو۔

أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ (۳۹)

فرمایا کہ کیا خدا نے تم سے قیامت تک کے لیے عہد کر رکھا ہے کہ جو تم چاہو گے تمھارے ساتھ وہی معاملہ ہو گا؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی عہد کی نشان دہی تم نہیں کر سکتے تو آخر وہ کیا چیز ہے جس کے بل پر تمھیں ناز ہے کہ نہ دنیا میں تمھیں کوئی ہلا سکتا اور نہ آخرت میں تم پر کوئی مسئولیت ہے!

یہ امر یہاں واضح رہے کہ قوموں سے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی فوز و فلاح کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ ایمان اور عمل صالح اور اس عہد کی پابندی کے ساتھ مشروط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے واسطہ سے لوگوں سے لیے ہیں۔ کسی قوم سے بھی اس نے کوئی ایسا عہد نہیں کیا ہے جو بالکل غیر مشروط طور پر قیامت تک کے لیے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کی دونوں شاخوں سے اللہ تعالیٰ نے امامت و پیشوائی کا جو عہد کیا وہ تورات میں بھی مذکور ہوا ہے اور قرآن میں بھی۔ اس میں بالکل واضح طور پر تشریح ہے کہ یہ عہد ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو خدا کے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوموں کی امامت پر سرفراز فرمانے کی بشارت دی کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرۃ ۲: ۱۲۴) (میں تم کو لوگوں کا ایک عظیم امام بنانے والا ہوں) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ (کیا یہ وعدہ میری ذریت سے متعلق بھی ہے؟) اللہ تعالیٰ نے اس کا فوراً جواب دیا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو تمھاری ذریت میں سے میرے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے) اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل سے متعلق ہے اسی طرح بنی اسماعیل سے بھی متعلق ہے۔ لیکن قریش نے بھی اولادِ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) ہونے کے زعم میں عنداللہ ہر مسئولیت سے اپنے کو بری سمجھ لیا اور بنی اسرائیل نے بھی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المآئدۃ ۵: ۱۸) کے غرور میں مبتلا ہو کر یہ گمان کر لیا کہ وہ آخرت کی ہر مسئولیت سے بالاتر ہیں۔

سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ۚ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۴۰-۴۱)

فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن بنتا ہے کہ ان کے لیے خدا نے نجات و فلاح کا غیر مشروط ابدی پروانہ جاری کر رکھا ہے؟ اگر ان کے کچھ شرکاء ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ وہ ان کے اوپر خدا کو ہاتھ ڈالنے نہ دیں گے تو ان کو پیش کریں اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں۔ یعنی ان کو دکھائیں ورنہ کم از کم ان کے نام ہی لیں تاکہ دوسروں کو بھی ان کی حیثیت و حقیقت کا کچھ اندازہ ہو ——— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کو اپنے جن معبودوں پر ناز تھا کہ وہ خدا کے بڑے چہیتے ہیں وہ ان کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے ان کی بے حقیقتی قرآن نے ہر پہلو سے اس طرح واضح کر دی ہے کہ اس چیلنج کے جواب میں وہ ان میں سے کسی کا نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۙ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ (۴۲-۴۳)

'کشفِ ساق' کا مفہوم

'کشفِ ساق' شدتِ امر کی تعبیر کے لیے عربی زبان کا معروف محاورہ ہے۔ شعرائے جاہلیت

نے مختلف طریقوں سے اس کو استعمال کیا ہے۔ حاتم کا مشہور شعر ہے۔

اخو الحرب ان عضّت بہ الحرب عضّھا　　وان شمرت عن ساقھا الحرب شمرا

(ممدوح جنگ کا مردِ میدان ہے۔ اگر جنگ اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو وہ بھی اس سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اگر گھمسان کا رن پڑتا ہے تو وہ بھی اس میں بے خطر کود پڑتا ہے)۔

اس شعر میں گھمسان کے رن کے لیے 'شمرت عن ساقھا الحرب' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

شدت امر کی تعبیر کے لیے اس محاورے کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب کوئی شدید ہلچل برپا ہوتی ہے تو اس وقت کنواریاں اور شریف زادیاں بھی اپنے پائنچے اٹھا کر بھاگنے پر مجبور ہوتی ہیں جس سے ان کی پنڈلیاں اور ان کے پاؤں کے زیورات کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

تذھل الشیخ عن بنیہ　　وتبدی عن خدام العقیلۃ العذراء

(ایسی ہلچل جو بوڑھوں کو ان کی اولاد سے غافل کر دے گی اور کنواریوں کی پنڈلیوں اور ان کی پازیبوں کو بے نقاب کر دے گی)

مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ تو یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جس عیش میں یہ یہاں ہیں اسی عیش میں وہاں بھی رہیں گے لیکن وہ دن بڑی ہلچل کا ہوگا۔ آج تو ان کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے ہیں لیکن اس دن سجدے کو کہا جائے گا تو سجدہ کے لیے جھکنا چاہیں گے لیکن ان کی کمریں اس طرح تختہ بن جائیں گی کہ کوشش کے باوجود نہیں جھک سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان کے اوپر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ ان کا پورا سراپا ان کی ذلت اور بےبسی کی گواہی دے رہا ہوگا۔

سجدہ کا یہ حکم ظاہر ہے کہ محض اتمامِ حجت اور رسوا کرنے کے لیے دیا جائے گا کہ ان کی سرکشی اور ان کی محرومی پر خود ان کا وجود ایسی گواہی ثبت کر دے جس کا وہ انکار نہ کر سکیں۔

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ معارج میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۝ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

جس دن کہ وہ قبروں سے نکلیں گے تیزی سے، گویا کہ وہ نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ وہ دن ہوگا جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

(المعارج - ۷۰: ۴۳-۴۴)

وہی مضمون جو سورۂ قلم میں 'يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اس آیت میں 'يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے، اس طرح لغت اور نظیرِ قرآن دونوں سے اسی مطلب کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے لیا ہے۔

بعض لوگوں نے ایک روایت کی بنا پر اس کے معنی یہ بھی لیے ہیں کہ جس دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، لیکن متعدد ائمۂ تفسیر سے وہی تاویل منقول ہوتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ عکرمہؒ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ 'ھُوَ یَوْمُ کَرْبٍ وَشِدَّۃٍ' (اس سے مراد قیامت کا دن ہے جو کرب و شدت کا دن ہوگا)۔ ابن جریرؒ نے ابن مسعودؓ یا ابن عباسؓ کے حوالہ سے کسی شاعر کا قول بھی مذکورہ معنی کی تائید میں نقل کیا ہے جس نے 'شالت الحرب عن ساق' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ مشہور امام تفسیر مجاہدؒ نے بھی اس کو شدتِ امر ہی کے مفہوم میں لیا ہے۔

فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ط سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴)

یہ ان مکذبینِ قرآن کو دھمکی ہے جن کا ذکر آیت ۱۵ میں گزر چکا ہے کہ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں کہتے ہیں یہ اگلوں کے فسانے ہیں) ان کو دھمکی کے ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں بہت بڑی تسلی بھی ہے۔ آپ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اب ان مکذبینِ قرآن کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہارے اوپر بلاغ کی جو ذمہ داری تھی وہ تم ادا کر چکے۔ اب تم بیچ سے ہٹو اور مجھے تنہا ان سے نمٹ لینے دو۔ میں درجہ بدرجہ ان کو وہاں سے ہلاکت کے کھڈ میں لے جاؤں گا جہاں سے ان کو علم بھی نہ ہوگا۔ اس وقت ان کو جو ڈھیل دے رہا ہوں اس کو وہ اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں حالانکہ وہ موت کے پھندے میں آئے ہوئے ہیں۔

مکذبین کو دھمکی

وَاُمْلِیْ لَھُمْ ط اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۴۵)

یعنی میں اس استدراج کے دوران ان کو اس لیے ڈھیل دے رہا ہوں کہ یہ اپنی جولانیاں دکھا لیں اور اپنا زور صرف کر لیں۔ ان کی رسی دراز کرنے میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ میرے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ میری تدبیر نہایت ہی محکم ہوتی ہے۔

اَمْ تَسْئَلُھُمْ اَجْرًا فَھُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۴۶)

یہ قرآن سے ان لوگوں کے فرار پر تعجب کا اظہار بھی ہے اور ان کو ملامت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ آخر یہ لوگ تمہاری بات سنتے کیوں نہیں؟ سننے میں ان کا کیا حرج ہوتا ہے؟ تم ان سے سنانے کا کوئی معاوضہ تو مانگ نہیں رہے ہو کہ یہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟ اس میں ضمناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اگر یہ نہیں سن رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو۔ اگر یہ اس نعمت سے بھاگ رہے ہیں تو اس میں انہی کی محرومی ہے۔ تم اپنے رب کے ہاں سرخرو ہو کہ یہ دولتِ آسمانی مفت لٹا رہے ہو۔

مکذبین کو ان کی محرومی پر ملامت

اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ (۴۷)

یہ بھی ان لوگوں کی اس بے پروائی اور بے نیازی پر اظہارِ تعجب ہے کہ آخر یہ کس بل بوتے پر اس انداز کو اس بے نیازی سے نظر انداز کر رہے ہیں! کیا ان کے پاس علمِ غیب ہے جو وہ لکھ

رہے ہیں کہ آخرت میں (اگر وہ ہوئی) ان کے لیے نہایت اعلیٰ مدارج ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی دلیل اور سند کے محض خواہشوں کی مدد سے اپنے لیے خیالی جنت آراستہ کر لینا اور زندگی کے حقائق سے آنکھیں بند کر لینا دانشمندی نہیں بلکہ اپنے لیے ابدی ہلاکت کا سامان کرنا ہے۔

یہ آیت سورۂ طور میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ سورۂ نجم میں یہ جس سیاق و سباق کے ساتھ آئی ہے اس سے اس کا پورا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ٥	کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے
اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ	(آخرت میں اپنے مدارج کو)؟ کیا موسیٰ کے صحیفوں میں
مُوْسٰى ٥ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ	جو بات بتائی گئی ہے اس کی خبر اس کو نہیں ملی؟ اور
وَفّٰٓى ٥ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ	اس ابراہیم کی تعلیمات میں بھی جس نے اپنے رب کے
وِّزْرَ اُخْرٰى ٥	ہر حکم کو پورا کیا؟ کہ کوئی جان بھی کسی بھی دوسری جان کا
(النجم-۵۳: ۳۵-۳۸)	بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ (۴۸)

نبی صلعم کو اپنی دعوت پر جمے رہنے کی تلقین

'فَاصْبِرْ' یہاں 'اِنْتَظِرْ' کے مفہوم پر متضمن ہے اس وجہ سے اس کے بعد 'ل' کا صلہ آیا ہے۔ یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و ثبات کی تلقین کے ساتھ تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ثابت قدم رہو اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس طرح کی جلد بازی سے بچو جو مچھلی والے (حضرت یونسؑ) سے صادر ہو گئی۔

'مچھلی والے' سے اشارہ ظاہر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف ہے۔ اس لقب سے ان کو ملقب کرنے میں ایک قسم کا پیار بھی ہے اور اس آزمائش کی طرف اشارہ بھی جو آنجناب کو پیش آئی۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی پوری تفصیل اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں کہ ان کی قوم نے ان کی دعوت کی جو ناقدری کی تو حق کی اس توہین سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پر ان کو عتاب ہوا جس کے نتیجہ میں ان کو مچھلی والا امتحان پیش آیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمائی گئی ہے کہ ہر چند تمھاری قوم بھی دعوت کی ناقدری اور تمھاری تکذیب پر مصر ہے لیکن تم میدان میں ڈٹے رہو اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ جب تک تمھارے رب کا حکم نہ ہو اپنی جگہ چھوڑنے کی غلطی نہ کرنا۔ مبادا تمھیں بھی اسی طرح کا کوئی امتحان پیش آ جائے جس طرح کا امتحان حضرت یونس علیہ السلام کو پیش آگیا۔

'اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ' یہ اجمالاً اس رویّہ کی طرف اشارہ ہے جو امتحان کے بعد حضرت یونسؑ

نے اختیار فرمایا۔ وہ فوراً ہی اپنی غلطی پر متنبہ ہوتے اور نہایت شدید قسم کے غم سے گھٹے ہوئے انھوں نے مچھلی کے پیٹ کے اندر اپنے رب سے فریاد کی۔ یہ فریاد جن زندۂ جاوید الفاظ[1] میں انھوں نے کی وہ دوسرے مقام میں نقل ہوئے ہیں اور ان کی بلاغت ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بطور بدرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ تاکہ لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ کے الفاظ سے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہو بلکہ یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ شدتِ تاثر سے مغلوب ہو کر ان سے ایک غلطی صادر تو ہو گئی لیکن فوراً ہی توبہ سے انھوں نے اس کی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر برگزیدگی سے نوازا، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ (۴۹-۵۰)

'نِعْمَةٌ' سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فضل ہے جو توبہ کے بعد ان کو قبولیتِ توبہ اور از سرِ نو فریضۂ رسالت پر ماموریت کی شکل میں حاصل ہوا۔ فرمایا کہ اگر ان پر اللہ کا یہ فضل نہ ہوا ہوتا تو جس ریت پر مچھلی نے ان کو ڈالا تھا اسی پر نہایت مذموم حالت میں وہ پڑے ہی رہ جاتے لیکن اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، ان کو اپنی رحمت سے نوازا، ان کو ان کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے از سرِ نو برگزیدہ کیا اور زمرۂ صالحین میں شامل فرمایا۔ یعنی اس دنیا سے وہ ناکام و نامراد نہیں گئے بلکہ بامرادوں کے زمرہ ـــــ صالحین ـــــ میں وہ شامل ہوئے۔

وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ (۵۱)

اس آیت کا تعلق بھی تلقینِ صبر و ثبات کے اس مضمون ہی سے ہے جو 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ' میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اگرچہ حالات نہایت سخت ہیں۔ کفار جب قرآن سنتے ہیں تو تمھیں اس طرح گھورتے اور ایسی تیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں دھکیل کر تمھارے مقام سے تمھیں پھسلا دیں گے اور جوشِ غضب میں تمھیں خبطی اور مجنوں بتاتے ہیں لیکن ان کے اس رویہ کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ یہاں ابتدائے سورہ کی آیت 'مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ' ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورہ جس مضمون سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہو رہی ہے۔

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ (۵۲)

یعنی اگر اس بات کو سن کر یہ تمھیں دیوانہ کہتے ہیں تو کہیں، لیکن یہ یاد رکھیں کہ یہ کسی دیوانے

---

[1] لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (الانبیاء - ۲۱: ۸۷)

کی بڑ نہیں بلکہ دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے۔ اس یاد دہانی سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو پچھتائیں گے لیکن یہ پچھتانا بے سود ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہٖ۔

رحمان آباد

۳۰۔ جولائی ۱۹۷۸ء

۲۳۔ شعبان ۱۳۹۸ھ